سورۂ فاتحہ کے بعض اہم مباحث

از

(جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

قرآنِ مجید کا یہ نہایت معروف اسلوبِ بیان ہے کہ وہ ایک ہی بات کو اکثر مقامات پر مختلف اغراض کے لئے متعدد انداز اور طریقوں سے بیان کرتا ہے اور کہیں تو اس میں حسبِ ضرورت کافی تفصیل اور کہیں بہت زیادہ ایجاز و اختصار ہوتا ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ ایک چھوٹی سی سورہ ہے لیکن اتنی محکم اور جامع ہے کہ دینِ حق کی تمام بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس میں جو کچھ مجملاً بیان ہوا ہے اسی کو پورے قرآن میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اس طرح یہ سورہ گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے کیوں کہ یہ تمام علوم و معارفِ قرآنیہ کی جامع، دینِ الٰہی کا خلاصہ، نیز قرآن کے شروع میں ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ نہایت غور و فکر کی محتاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس کی نہایت شرح و بسط کے ساتھ تفسیریں لکھی ہیں اور اس سورہ کی انھیں خصوصیات کے پیشِ نظر ہم بھی اس کے بعض اہم مباحث سے تعرض کرتے ہیں۔

وہ اہم مباحث مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) کیا بسم اللہ اس سورہ کا جزء ہے؟

(۲) لفظ اللہ کا لغوی اور علمی مفہوم کیا ہے؟

(۳) رحمان و رحیم میں کیا فرق ہے؟

(۴) سورۂ فاتحہ میں کتنی آیتیں ہیں؟

(۵) اس کا زمانۂ نزول کیا ہے؟

(۶) اسے قرآنِ مجید کی ابتداء میں کیوں رکھا گیا؟

(۷) حمد کا وسیع اور جامع مفہوم کیا ہوگا؟

(۸) منعم علیہم، مغضوب علیہم اور ضالین سے کون لوگ مراد ہیں؟

(۹) غیر کا اعراب کیا ہے؟

(۱۰) سورۂ فاتحہ اور نماز میں مناسبت کے کیا پہلو ہیں؟ اور کیا سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوگی؟۔

یہ سوالات اگرچہ نہایت اہم اور دقت طلب ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے بڑے علم و فہم اور کافی مطالعہ کی ضرورت ہے، راقم الحروف کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا پورا احساس ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے جو کچھ ان پر غور و فکر کر سکا ہے اسے اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے وباللہ التوفیق۔

کیا بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے | اس سلسلہ میں اہل علم کی کئی رائیں ہیں۔

(۱) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے دو اقوال مروی ہیں اور غالباً صحیح قول یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے اور یہی سفیان ثوریؒ اور عبداللہ ابن مبارکؒ کا بھی مسلک ہے۔

(۲) ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ برأت کے علاوہ قرآن کی تمام سورتوں کا جزء ہے اور علامہ ابن کثیرؒ نے ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر، ابوہریرہ، علی، عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، مکحول، زہری، ابن مبارک، احمد اور اسحاق (رحمہم اللہ علیہم) کا بھی یہی مسلک بتایا ہے۔

(۳) امام مالک، امام اوزاعی اور بعض کے خیال میں امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے نزدیک یہ صرف سورۂ نمل کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے اور کسی سورہ کا جزء نہیں۔

یہ بحث بعد میں ہوگی کہ سورۂ فاتحہ کے اندر کتنی آیتیں ہیں تاہم یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اس اختلاف کا سبب فی الاصل وہی روایتیں ہیں جن سے بسم اللہ کا اس سورہ کی آیت

ہونا یا نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اوپر بسم اللہ کے جزو فاتحہ ہونے کے سلسلہ میں جو اقوال نقل کئے گئے ہیں باوجود اس کے کہ وہ بڑے بڑے ائمہ کی طرف منسوب ہیں جن کی عظمت و جلالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مگر اس کے باوجود مجھے کسی قول پر اطمینان نہ ہو سکا اس لئے اگر ان کا احترام و ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی رائے سے اختلاف کروں تو شاید نامناسب نہ ہو۔

پہلا قول اس لئے صحیح نہیں ہے کہ بسم اللہ ہر سورہ کے شروع میں ہوتا ہے اور دوسرا اور تیسرا قول بھی بوجوہ صحیح نہیں معلوم ہوتا یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سے اس مسئلہ میں کوئی صاف اور صریح قول منقول نہیں علامہ کرخی کا بیان ہے کہ متقدمین حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں تھا۔ اور بعض فقہاء احناف کا بیان ہے کہ امام اعظم نے اس مسئلہ میں غور و خوض کرنے سے احتیاط برتی ——— مگر چوں کہ بسم اللہ قرآن کے اندر موجود ہے اس لئے اسے لامحالہ اس کا جز ماننا پڑے گا لیکن اس کی حیثیت مستقل آیت کی ہے وہ سورۂ فاتحہ یا کسی اور سورہ کا جز نہیں بلکہ نفسِ قرآن کا جز ہے۔ حنفیہ میں محمد بن حسن شیبانی کا مشہور قول ہے کہ "ما بین الدفتین قرآن" اور یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ بسم اللہ کو سورۂ نمل کے سوا قرآن کا حصہ نہیں مانتے ان کا قول حد درجہ ضعیف ہے چنانچہ بعض سلف سے اس طرح کے اقوال مروی ہیں اور ابو بکر جصاص صاحب احکام القرآن کی تو بعینہ یہی رائے ہے دیکھو تفسیر کبیر۔

البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر ہر ہر سورہ کے شروع میں یہ کیوں لکھا جاتا ہے تو اس کی وجہ ابو بکر جصاص نے یہ بتائی ہے کہ "تاکہ ہر دو سورہ کے درمیان فصل ہو جائے"۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ بسم اللہ کا معاملہ ایک کلی آیت کا سا ہے اس لئے اس کو کسی مخصوص سورہ میں شامل کر کے اور دوسری سورہ میں نہ شامل کر کے تفریق کرنا صحیح نہیں ہے لیکن سورۂ فاتحہ چوں کہ قرآن کے شروع میں ہے اس لئے بسم اللہ کا اصل مقام بھی وہیں ہے ہر چند کہ

وہ اس کا جز نہیں بلکہ قرآن کا جزء ہے اور بقیہ سورتوں کے شروع میں فصل کے لئے لایا جاتا ہے

نیز ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی جب کوئی سورہ ختم کر کے دوسری سورہ پڑھنے لگے تو بسم اللہ پڑھ لیا کرے کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَ اَبِبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

لفظ اللہ کی علمی تحقیق | اس لفظ کے صحیح اور اصل مفہوم کی وضاحت اس لئے بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علمائے نصاریٰ نے اس کے متعلق بڑی دھاندلی مچائی ہے، علم و تحقیق اور تہذیب و اخلاق ہر ایک ان کی اس اخلاقی دنائت پر نوحہ زن ہیں۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ لفظ نہایت قدیم ہے اور دراصل یہ "الٰہ" تھا جس پر الف لام تعریف کے لئے لایا گیا ہے اس لئے جب "اللہ" کہیں گے تو صرف اسم ذات مراد ہوگی یعنی وہ اللہ جو ایک ہے آسمان، زمین اور تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے اور اس مفہوم کو اسلام سے قبل اہل عرب بھی اچھی طرح جانتے تھے کیوں کہ شرک و بت پرستی کی آلودگیوں میں ملوث ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے کسی معبود کو اللہ کے برابر نہیں گردانتے تھے انھیں اس کا مکمل اعتراف تھا کہ آسمان و زمین کا خالق اللہ ہی ہے :-

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج و چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ ہی نے ! پھر یہ کہاں ٹھیک رہے ہیں

معبودانِ باطل کی عبادت تو اس لئے کرتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں شفاعت کریں گے

هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

یہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کریں گے

اور اس کا مقرب بنائیں گے

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ہم ان کی عبادت صرف خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ بہت قدیم ہے اور عربوں نے دین کی اگرچہ بہت سی چیزوں کو بھلا دیا تھا مگر اس لفظ کو جانتے، بولتے اور سمجھتے تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عربوں کو دینِ صحیح کی جو کچھ میراث ملی تھی اس میں یہ کلمہ بھی شامل ہے خود توراۃ میں مختلف پیغمبروں کے ذکر کے سلسلہ میں یہ لفظ ملتا ہے مگر علماء نصاری نے اس کے متعلق کتنا سنگین علمی اور اخلاقی جرم کیا ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ علماء امت نے اس لفظ کے سلسلہ میں کیا کیا نکات اور حقائق بیان فرمائے ہیں۔

امام رازیؒ کے ارشاد کے مطابق اکثر علماء کے یہاں یہ لفظ علم مگر بعض مشتق بھی مانتے ہیں (میں بھی اسی کو ترجیح دیتا ہوں) اور ان سے متعدد اقوال منقول ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

(۱) بعض کے نزدیک یہ "الہہ الی" سے مشتق ہے اور اس کے معنی سکون و اطمینان کے ہیں پس اللہ کو اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذکر سے عقل کو اور اس کی معرفت سے روح کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

(۲) کچھ لوگوں کے نزدیک یہ "لایلیہہ" سے مشتق ہے جس کے معنی بلند و بالا ہونے کے آتے ہیں اس لئے اللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ بلند و برتر ہے یعنی عالم ممکنات و حوادث کی ہر ہر چیز کی مشابہت سے اعلی و ارفع ہے۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ "لاہ" کے معنی مخفی اور پوشیدہ ہونے کے ہیں اور اللہ چوں کہ گوناگوں حیثیتوں سے مخفی ہے اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں۔

(۴) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "الہہ فی الشئی" سے نکلا ہے جس کے معنی متحیر ہونے کے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ایک بندہ جب غور و فکر کرتا ہے تو اس کی عقل حیران اور فکر درماندہ ہو جاتی ہے اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی رائے

کو ترجیح دی ہے اور ترجمان القرآن جلد اول میں اس پر اپنے مخصوص اندازِ نگارش میں بڑی دلآویز بحث کی ہے۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ یہ " ولہ، وولاہ " سے مشتق ہے اور اللہ بمعنی مولوہ (محبوب) کے ہے پس اللہ کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ ذات جس سے اس کے احسانات کی بنار پر محبت کی جاتی ہے۔

(۶) بعض کے نزدیک " ولہ وولاہ " ہی سے یہ مشتق ہے مگر اللہ والہ (محب) کے معنی میں ہے یعنی وہ ذات جو اپنی مخلوقات پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

بعض علمائے متاخرین کے نزدیک ان سب معنوں کو محیط ہے اور یہی بڑی حد تک صحیح بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ اس طرح کی تمام خوبیوں کو شامل ہوتا ہم خدا کا یہ وصف کہ وہ اپنے بندوں پر نہایت رؤف و رحیم ہے اور مخلوقات پر اس کے بے پایاں اور بے شمار احسانات ہیں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس مناسبت سے خیال ہوتا ہے کہ اللہ بمعنی والہ قوب الی الصواب ہے۔ واللہ اعلم

(۳) رحمان و رحیم | یہ بات اپنی جگہ پر بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ رحمان و رحیم میں ضرور فرق ہونا چاہئے کیوں کہ رحمان فعلان کا صیغہ ہے جو بالعموم مبالغہ تکثیر اور عارضی، پرجوش صفات کے لئے استعمال ہوتا ہے اور رحیم فعیل کا صیغہ ہے جو ثابتہ معانی اور فطری و عادی صفات کے اظہار کے لئے لایا جاتا ہے، اس لئے ہمارے نزدیک ان لوگوں کی بات نہایت سخیف معلوم ہوتی ہے جو رحمان و رحیم میں کوئی فرق ہی نہیں کرتے حالانکہ تمام اجلۂ مفسرین اور لغت و عربیت شناس علمار نے ان میں فرق قایم کیا ہے، علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں :-

بل لکل کلمۃ منھما معنیً لاتؤدی الاخری	ہر کلمہ ایسا معنی رکھتا ہے جسے دوسرا نہیں ادا کر سکتا۔

روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رحمان و رحیم میں فرق ہے اس لئے ہمیں ان روایات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اگرچہ یہ روایتیں آپس میں مختلف ہیں اور ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ اتنا ضرور فیصلہ ہو سکتا ہے کہ رحمان و رحیم میں باہم فرق ہے۔

اب آؤ دیکھیں کہ ان دونوں کے درمیان فی الواقع کیا فرق ہو سکتا ہے۔

(۱) رحمان بطور علم کے استعمال ہوتا ہے اسی لئے اس پر الف لام داخل کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا اطلاق اللہ کے علاوہ کسی اور ذات پر نہیں ہو سکتا، اور رحیم بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے اسی لئے خدا کے ساتھ ساتھ بندوں کے لئے بھی یہ وصف بولا جاتا ہے قرآن مجید میں آں حضرتؐ کے بارہ میں کہا گیا ہے:۔

حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ — تم پر حریص اور مومنوں پر شفیق اور مہربان ہے

سورۂ فتح میں صحابہ کا وصف یوں بیان کیا گیا ہے:۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ — کافروں پر سخت آپس میں مہربان۔

(۲) رحمان مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم صفت کا اس لئے رحمان عموم و تکثیر کو شامل ہے، یعنی بہت بڑا مہربان جس کے انعامات و احسانات بے پایاں ہیں جس کی رحمتیں عام اور ہر ایک پر فیض و کرم کرنے والا ہے، اور رحیم میں رحمان کی سی عموم و تکثیر نہیں ہوتی البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ رحیم اللہ تعالیٰ صرف مومنوں پر ہے یا صرف دنیا میں۔ صاحب تفسیر کبیر فرماتے ہیں الرحمان هو المنعم بما لا يتصور صدور جنسه من العباد والرحيم هو المنعم بما يتصور صدور جنسه من العباد

(۳) رحمان فعلان کا صیغہ ہے اس لئے اس کا استعمال صفاتِ عارضہ کے لئے ہوتا ہے اور رحیم فعیل کا صیغہ ہے اس لئے صفاتِ قائمہ پر دلالت کرتا ہے۔

رحمان کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ: بعض لوگ جنہیں کلامِ عرب سے واقفیت نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم

خدا کی قدیم صفت اور عربوں کے یہاں معروف تھی لیکن رحمان کا لفظ ان کے یہاں عام اور معروف نہ تھا اور نہ وہ خدا کو اس نام سے موسوم کرتے تھے اور پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود قرآنِ مجید ہی سے اس غلط خیال کی تائید بھی پیش کرتے ہیں:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ — اور جب ان سے رحمٰن کے لئے سجدہ کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں رحمان کیا ہے؟

حالاں کہ اس آیت سے اپنے مدعا کی دلیل فراہم کرنا قرآن مجید کے اسلوبِ بیان اور طرزِ استدلال سے ناواقفیت اور بے خبری کی سب سے بڑی دلیل ہے کیا قرآن نے مشرکین ہی کی زبان سے یہ نہیں کہا ہے کہ:-

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ — انھوں نے کہا کہ اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی بندگی نہ کرتے

اور عربوں کے کلام میں اس لفظ کا کثرتِ استعمال ان کے مدعا کے بطلان کی سب سے بڑی دلیل ہے، امرؤ القیس کا شعر ہے:-

تلك السحاب اذا الرحمان ارسلها — رَوَّى بها من محول الارض ايباسا

ترجمہ یہ بادل ہیں جنہیں بھیج کر رحمان خشک اور ویران زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔

اعشیٰ قیس کہتا ہے:-

ولا جعل الرحمان بيتك فى العلا — باَجْيَادَ غَرْبِيَّ الصَّفَا وَ الْمُحَرَّمِ

ترجمہ اور رحمٰن تیرا گھر صفا اور حرم کے مغرب میں مقام اجیاد کی بلندیوں میں نہ کرے۔

مثقب عبدی کا شعر ہے:-

لحى الرحمان اقواما اضاعوا — على الوعواع افراسى وعيسى

ترجمہ خدائے رحمان ان لوگوں کا ستیاناس کرے جنہوں نے مقام وعواع میں میرے گھوڑوں اور اونٹوں کو ہلاک کر ڈالا۔

سوید بن ابی کاہل یشکری کہتا ہے:۔

کتب الرحمان والحمدُ لہ سعۃ الاخلاق فینا والضَلَعُ

ترجمہ رحمان (سارا شکر اسی کے لئے) نے ہمارے اندر اخلاق کی قوت و وسعت مقدر فرمادی ہے۔

سلامۃ بن جندل طہوری کا شعر ہے:۔

عجلتم عجلتینا علیکم وما یشاء الرحمان یعقد ویطلق

ترجمہ تم نے ہمارے ساتھ ویسی ہی عجلت کی جیسے کہ ہم نے تم پر عجلت کی تھی حالانکہ خدائے رحمان جو چاہتا ہے طے تمام کر دیتا ہے۔

زید بن عمرو بن نفیل فرماتے ہیں:۔

ولکن اعبد الرحمان ربی لیغفر ذنبی الربُّ الغفورُ

ترجمہ میں اپنے پروردگار رحمان کی بندگی کرتا ہوں تاکہ بخشنے والا پروردگار میرے گناہ کو بخش دے۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ اہلِ عرب زمانۂ جاہلیت میں عبدالرحمان وغیرہ نام بھی رکھا کرتے تھے

ان ساری قوی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنے کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے کہ عرب جاہلیت میں اسم رحمان سے ناواقف تھے۔ اور قرآن نے آکر لغت عربی میں اس نئے لفظ کا اضافہ کیا ان ھذا لشیٔ عجاب

سورۂ فاتحہ کی آیتوں کی تعداد | اس سورہ کی آیتوں کے متعلق اجماع ہے کہ اس میں سات آیتیں ہیں اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ

ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی میں سے یعنی قرآنِ عظیم دیا۔

البتہ امام رازیؒ نے حسن بصریؒ کے ایک شاذ قول کا تذکرہ کیا ہے کہ ان کے نزدیک اس میں آٹھ آیتیں ہیں مگر یہ قول لایُعنیٰ بہ ہے اس لئے کہ شاذ ہے اور ثانیاً حضرت حسن بصریؒ کی طرف اس کا انتساب بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے سورۂ فاتحہ کی آیتوں کی تعداد میں

کوئی اختلاف نہیں البتہ اختلاف اس امر میں ہے کہ بسم اللہ کو شامل کرکے سات آیتیں ہیں یا بسم اللہ کے علاوہ سات آیتیں ہیں۔

(۱) امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک بسم اللہ کو لے کر سات آیتیں ہیں

(۲) اور امام ابوحنیفہ اور امام دار الہجرت (مالک) رحمہما اللہ کے نزدیک بسم اللہ کو چھوڑ کر سات آیتیں ہیں۔ اور یہی بات راقم الحروف کے نزدیک بھی صحیح ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ بھی سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لایق اعتماد حضرت ابوہریرۃ کی وہ مشہور روایت "قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی" ہوسکتی ہے مگر یہ بھی خوب اور عجیب بات ہے کہ اس روایت کو ہر دو فریق نے اپنے مسلک کی تائید میں پیش کیا ہے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سے صرف حنفیہ اور مالکیہ کی تائید ہوتی ہے اور یہی ایک روایت درحقیقت حجت اور اعتماد کے قابل ہے اور ہمارے نزدیک چوں کہ اس سے احناف کی تائید ہوتی ہے اس لئے ہم نے اسی خیال کو ترجیح دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں مانتے بلکہ قرآن کا جزء مانتے ہیں اس لئے لامحالہ ہمارے نزدیک بسم اللہ قرآن کی آیت ہے نہ کہ سورۂ فاتحہ کی۔

ثالثاً یہ اصولی بات ہے کہ سورۂ فاتحہ کی آیتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہونا چاہئے جہاں سے سورہ کا مضمون چل رہا ہے اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سورۂ فاتحہ کا مضمون "بسم اللہ" سے نہیں "الحمد للہ" سے شروع ہوتا ہے اس لئے الحمد للہ ہی سے سورۂ فاتحہ کی آیتیں بھی شروع ہوں گی۔

(۵) سورۂ فاتحہ کا زمانۂ نزول | ہمارے علماء نے سورۂ فاتحہ کے زمانۂ نزول کے متعلق بھی باہم اختلاف کیا ہے ان کے جو اقوال ہمیں کتب تفسیر سے معلوم ہوسکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) اکثر علماء کے نزدیک یہ سورہ مکی ہے۔

(۲) مجاہدؒ کے نزدیک یہ مدنی ہے۔

(۳) بعضوں کے نزدیک یہ سورہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہے ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں تحویل قبلہ کے وقت۔

(۴) ابو اللیث سمرقندی نے ایک حکایت یہ بھی نقل کی ہے کہ یہ نصف مکی اور نصف مدنی ہے۔

جمہور کی سب سے قوی دلیل سورۂ حجر کی یہ آیت ہے (وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ) کیوں کہ بالاتفاق "سبع مثانی" سے سورۂ فاتحہ مراد ہے اور سورۂ حجر بھی متفقہ طور پر مکی ہے اس لئے سورۂ فاتحہ کا مکی ہونا بھی ایک نہایت واضح امر ہے۔ اور ہمارے نزدیک بھی جمہور ہی کا مسلک راجح مگر ہم ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلی وحی ہے یعنی قرآن کی تمام سورتوں اور آیتوں سے پیشتر یہ سورہ نازل ہوئی ہے اور یہ سراسر نکتہ آفرینی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت میں چند نہایت واضح اور گرانقدر دلائل بھی ہیں۔

(۱) سورۂ فاتحہ کے متعلق تو یہ نہایت عام اور مشہور بات ہے کہ یہ تمام تعلیماتِ قرآنی کا لب لباب ہے یعنی جو حقایق اس سورہ میں نہایت ایجاز کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اسی کو قرآن کے دوسرے حصوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لئے سورۂ فاتحہ گویا قرآن کا دیباچہ اور مقدمہ ہے اور اسی لئے ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ترتیب کی طرح نزول میں بھی یہ سورہ تمام سورتوں پر مقدم ہے یعنی نبی اکرمؐ کو سماء دنیوی سے قرآن کا سب سے پہلے یہی حصہ دیا گیا تھا کیوں کہ قرآنِ مجید عموماً کسی بات کو اختصار سے پہلے بیان کرتا ہے بعد ازاں اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

(۲) اب اسی بات کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے کہ سورۂ فاتحہ میں بنیادی حقائقِ

دینیہ کا بیان ہے اور تبلیغِ ادیان کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے کلیات اور اصول کی دعوت دی جاتی ہے پھر اس کے بعد جب مخاطب دعوتِ دین کے کلیات اور اصولوں سے مانوس ہو جاتا ہے تو جزئیات اور فروعی مسائل سے اسے آگاہ کیا جاتا ہے اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے آپ کو دی گئی تاکہ آپ لوگوں کو سب سے پہلے دینِ الٰہی کے اصول اور کلیات سے آشنا کر دیں۔

(۳) اس کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ نماز مکہ میں فرض ہو گئی تھی اور سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز خداج ہوتی ہے اس لئے اگر یہ مسلّم ہے کہ نماز مکہ میں فرض ہو چکی تھی تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر سورۂ فاتحہ نہیں نازل ہوئی تھی تو لوگ نمازوں میں کیا پڑھتے تھے اسی اشکال کے پیشِ نظر قاضی بیضاویؒ ایک قول یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ میں فرضیتِ صلوٰۃ اور مدینہ میں تحویلِ قبلہ کے وقت نازل ہوئی تھی اب اگر یہ کہا جائے کہ نماز تو شبِ معراج میں فرض ہوئی تھی تو صحیح ہے لیکن اس حقیقتِ ثابتہ میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ رسولِ کریمؐ ابتداء وحی سے ہی نمازیں پڑھا کرتے تھے اور اس کے لئے ہمارے پاس بعض اشارات اور واضح دلائل بھی ہیں مگر یہ موقعہ تفصیل میں پڑنے کا نہیں۔

(۴) بعض آثار سے علماء محققین اور اسلافِ امت کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔

عن عمرو بن شرحبیل انہ قال	عمرو بن شرحبیل فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے قرآن میں
اول ما نزل من القرآن الحمد	سے الحمد للہ نازل ہوا۔
للہ رب العالمین	

علامہ ابن جریر اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کی ایک روایت نقل کی ہے مگر اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سب سے پہلے نازل ہوا مگر ہمارے خیال سے اس روایت میں راوی کو سہو ہو گیا ہے اور اس نے سورۂ فاتحہ کے ذکر کو چھوڑ دیا حالاں کہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ بسم اللہ اگر پہلے نازل ہوا ہے تو اسی کے ساتھ ہی سورۂ فاتحہ بھی نازل ہوئی ہے اور اس

خیال کو اس بات سے مزید تقویت بھی ہوتی ہے کہ بسم اللہ کو بہت سے لوگ سورۂ فاتحہ کا جزء مانتے ہیں۔

عمرو بن شرحبیل کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اس قسم کی ایک روایت ملتی ہے مصر کے بعض جدید اور مشہور علما، کی بھی یہی رائے ہے اور صاحبِ کشاف نے سورۂ علق کی تفسیر میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ :-

"ابن عباس اور مجاہد سے روایت ہے کہ سورۂ علق پہلے نازل ہوئی مگر جمہور مفسرین کے نزدیک سورۂ فاتحہ پہلے اور پھر سورۂ قلم نازل ہوئی"

اگر صاحبِ کشاف نے یہ صحیح لکھا ہے تو پھر ہمیں کوئی دلیل دینے کی بھی ضرورت نہیں۔

(۶) سورۂ فاتحہ کو قرآن کے شروع میں کیوں رکھا گیا؟

اس سوال کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لئے چند در چند طریقوں سے غور کرنا چاہیئے۔

یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ "سورۂ فاتحہ" سارے علومِ قرآنیہ کی جامع ہے اسی لئے اس سورہ کا ایک نام "موفیہ" بھی ہے گویا یہ پورے قرآن کا دیباچہ ہے اور کسی کتاب کا دیباچہ کتاب کا جزء ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حیثیت سے اپنی ایک الگ اور مستقل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس طرح دیباچہ کتاب کتاب سے الگ اور زائد شئی بھی ہوتا ہے اور ہمارے اس خیال کی دلیل خود قرآنِ حکیم کی یہ آیت ہے۔ (وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ)

یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ "وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ" میں واؤ تفسیر کے لئے لایا گیا ہے اور بات یہ کہنی ہے کہ اے نبی ہم نے تمہیں سبع مثانی (سورۂ فاتحہ) یعنی قرآنِ عظیم دیا ہے گویا "سَبْعَ مَثَانِي" خود ایک مستقل قرآن ہے اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ واو تفسیر و بیان کے لئے نہیں لایا گیا ہے جب بھی ہمارے مفہوم میں کوئی قباحت نہیں پیدا ہوتی کیوں کہ "سبع مثانی" اور "قرآنِ عظیم" دو مختلف چیزیں کہنے کا بھی یہی مطلب ہوگا کہ "سبع

مثانی" کی خود ایک مستقل اور نمایاں حیثیت ہے۔

رہی یہ بات کہ سورۂ فاتحہ قرآن کے مفصل اجزاء کا مجمل خاکہ کیوں کر ہے تو یہ بھی بالکل واضح ہے کیوں کہ قرآن نے تین طرح کے مضامین بیان کئے ہیں:۔

(۱) توحید۔

(۲) شرائع۔

(۳) معاد۔

اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ فاتحہ میں انھیں تینوں حقائق کا بیان ہے، اس کی ایک ایک آیت اپنے اندر اتنی وسعت رکھتی ہے کہ اس کا احاطہ ناممکن ہے اور انھیں چند آیتوں کے اندر سارا دین سمیٹ دیا گیا ہے۔

اب جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ سورۂ فاتحہ پورے دین کا مجمل نقشہ، سارے قرآن کا خلاصہ اور دیباچہ نیز اس کے مفصل اجزا رثلاثہ کا خاکہ ہے تو لازماً اسے سارے قرآن پر مقدم ہی ہونا چاہیئے، تاکہ اگر کوئی شخص پوری دقتِ نظر کے ساتھ سورۂ فاتحہ کو پڑھ لے تو وہ دینِ الٰہی کے تمام مقاصد سے آگاہ ہو جائے اور قرآن کے سارے علوم و حقایق اس کی نظروں کے سامنے آشکارا ہو جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی بات کو اپنے دل نشین پیرایۂ بیان میں یوں واضح فرماتے ہیں:۔

"چنانچہ اس سورہ کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دینِ حق کے جو مقاصد بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں سورۂ فاتحہ میں انھیں کا بشکل اجمال بیان موجود ہے اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے صرف اس سورہ کے مطالب ذہن نشین کر لے جب بھی وہ دینِ حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل[1] ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن ج اول ص ۲۶

دوسری حیثیت سے غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک دل ربا نغمہ ہے جو انسان کی اصل فطرت میں ہر وقت موجزن رہتا ہے۔ یہ فطرت کی صحیح تصویر ہے، اس کے آئینہ میں فطرت کی اصلی پکار پنہاں ہے، فطرتِ انسانی کے حسین نغموں اور اصلی آوازوں کو پوری سورہ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہ سورہ شکر و حمد کی سورہ ہے یعنی جب انسان کائنات کے ہمہ گیر اور محکم نظام پر غور کرتا ہے، خالق کائنات کی کاریگری دیکھتا ہے، زیب و زینت الٰہی کے عظیم الشان مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے اور قدرت کے رنگ برنگ جلووں سے اس کی نگاہیں ٹکراتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو کسی عظیم اور بالادست ہاتھوں کی گرفت میں پاتا ہے۔ کسی مخفی اور باتدبیر ہستی کی تخلیق کا اپنے کو اور پوری کائنات کو رہینِ منت سمجھتا ہے۔ اور یقین کرتا ہے کہ کسی منعم کی طرح طرح کی نعمتیں، نوازشوں اور رحمتوں میں میں گھرا ہوا ہوں ——— جب یہ احساس ہو جاتا ہے تو اس پر ایک خاص طرح کا تاثر طاری ہوتا ہے یعنی شکر و سپاس کے بے پایاں جذبات اس کے اندر لبریز ہو جاتے ہیں اور وہ سرتاپا حمد و ستائش بن جاتا ہے اور بے اختیار اور بلا قصد و ارادہ خدا کے احسانات کے سامنے خم ہو کر اس کی گراں قدر مہربانیوں اور کرم فرمائیوں کے صلہ میں انھیں کلمات کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے ——— یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص اپنی اور پوری کائنات کی خلقت پر غور کرے اور اس پر یہ تاثر طاری نہ ہو اور وہ ان کلمات کے اظہار پر مجبور نہ ہو جائے کیوں کہ یہ سارے کلمات شکر، ایمان، اسلام، توکل، تسلیم، اخلاص اور اقرار عبودیت کے عین آئینہ دار ہیں۔

پس سورۂ فاتحہ انسان کے ذہن کی فطری اور اولین آواز ہے، اگر کوئی بہت ہی بلید نہیں ہے تو وہ فطرت کے جلووں میں، اپنے دل کی گہرائیوں میں اور ہاں سارے صفحہ کائنات میں اس دلآویز اور دل کش نغمہ کو لکھا ہوا دیکھ سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ زمین و آسمان کے گوشہ گوشہ میں یہی نغمہ لاپا جا رہا ہے (وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) ظاہر و باطن ہر ایک اسی نغمۂ ازلی و ابدی سے معمور ہیں اور آسمان و زمین کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے خالق کائنات

کی تسبیح میں زمزمہ سنج ہے (وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ) مولانا آزاد فرماتے ہیں :۔

" حمد سے سورہ کی ابتداء کیوں ہوئی ہے، اس لئے کہ معرفت الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اس کے فکر و وجدان پر طاری ہوگی وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے ——— انسان کے لئے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے، قرآن کہتا ہے صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کائناتِ خلقت میں تدبر و تفکر کرے، مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع تک پہنچا دے گا " اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا الآیۃ "

غور کرو جب فطرت کی اصل اور اولین پکار یہ ہے، معرفتِ ربانی کا اصلی اور ابتدائی تاثر یہ ہے اور پوری کائنات اور خود ذہنِ انسانی کا یہ گیت ہے تو لا محالہ اس ابتدائی تاثر، فطری پکار اور دل آویز نغمہ کو قرآن کے شروع میں ہونا چاہیئے، تیسرے پہلو سے دیکھو کہ قرآن حیاتِ انسانی کا ایک مکمل دستور ہے، خدا کا بندوں کے نام پیغام اور لائحہ عمل ہے، انسان کی زندگی کے جتنے شعبے اور اجزاء ہو سکتے ہیں سب کے لئے مکمل رہنمائی اس میں موجود ہے تو پھر لا محالہ سورۂ شکر و حمد کو مقدم ہی ہونا چاہیئے کیوں کہ یہ سورہ اس ضابطہ زندگی اور دستور العمل کا شکریہ اور سپاسنامہ ہے۔

ایک اور پہلو سے غور کیجئے کہ سورۂ فاتحہ سورۂ صلوۃ ہے یعنی نماز کی اصلی روح سورۂ فاتحہ کے اندر مضمر ہے اور نماز کا حال یہ ہے کہ وہ سارے دینی احکام میں مقدم ہے یعنی ایمان و اعتقاد کے بعد اعمال و احکام میں نماز سب سے اولین چیز ہے اس لئے سورۂ صلوٰۃ کو بھی سارے قرآن پر مقدم رکھا گیا جس طرح نماز کو تمام اعمال میں تقدم حاصل ہے۔

ایک آخری پہلو یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ چوں کہ قرآن کا دیباچہ اور دینِ حق کا خلاصہ ہے اس لئے قرآن کی یہ سب سے اہم سورہ ہے اور جو چیز جتنی اہم ہوتی ہے اسے اتنے ہی پہلے بیان کیا جاتا ہے۔ مولانا ابو الکلام بھی اس رائے سے متفق معلوم ہوتے ہیں :۔

"اور یہ قرآن کی سب سے پہلی سورہ ہے اس لئے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورہ قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی اس لئے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی۔"

(۷) حمد کا مفہوم | عربی زبان میں حمد، مدح اور حمد و شکر کو بڑی حد تک مترادف الفاظ سمجھا جاتا ہے اس لئے ہمارے علماء نے ان میں جو باہمی فروق قائم کئے ہیں انھیں بھی پیش نظر رکھنا چاہیے

امام راغب مفردات میں رقم طراز ہیں:۔

الحمد للہ تعالیٰ الثناء علیہ بالفضیلۃ وھو اخص من المدح واعم من الشکر فان المدح یقال فیما یکون من الانسان باختیارہ ومما یقال منہ وفیہ بالتسخیر فقد یمدح الانسان بطول قامتہ وصباحۃ وجھہ کما یمدح ببذل مالہ وسخائہ وعلمہ والحمد یکون فی الثانی دون الاول والشکر لا یقال الا فی مقابلۃ النعمۃ فکل شکر حمد ولیس کل حمد شکرا وکل حمد مدح ولیس کل مدح حمداً"

علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں:۔

"الحمد والمدح اخوان وھو الثناء علی الجمیل من نعمۃ وغیرہ تقول حمدت الرجل علی انعامہ وحمدتہ علی حسبہ وشجاعتہ واما الشکر فعلی النعمۃ خاصۃ وھو بالقلب واللسان والجوارح .... والحمد باللسان وحدہ فھو احدی شعب الشکر .... والحمد نقیضہ الذم والشکر نقیضہ الکفران"

امام راغب نے حمد و شکر اور مدح و حمد میں عام خاص من وجہ کا فرق بتایا ہے مگر صاحب کشاف نے حمد اور مدح میں کوئی فرق نہیں ظاہر کیا ہے البتہ حمد اور شکر میں چند فروق بیان فرمائے ہیں (الف) حمد مطلقاً ہر کمال اور احسان کے لئے بولا جاتا ہے لیکن شکر صرف نعمت کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ (ب) حمد کا اظہار صرف زبان سے ہوتا ہے لیکن شکر زبان، دل اور جوارح ہر ایک سے ادا کیا جاتا ہے (س) حمد ذم کا مقابل ہے اور شکر کفران کا ضد ہے۔ (باقی)